

جذبہ

05-31-2017



فہرست

صحت

۱. سائنٹ کٹر
۲. ماحولیاتی آلودگی کا شکار بچے
۳. نئی زندگی

سچی کہانیاں

۴. حکیم صاحب
 ۶. ننھی پری
 ۷. ہمارا گھر مندر بن گیا تھا
-

سائنٹس کلر

مصنف: یوسف

یہ کسی فلم یا لکچر کا نام نہیں بلکہ دنیا بھر میں انسانی اس خاموش قاتل کے شکار ہیں اور یہ قاتل انسان کے وجود میں آنے کے بعد اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے انحصار اس بات پر بھی کرتا ہے کہ انسان کس خطے یا ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہے روزمرہ کی مصروفیات کیا ہیں ، کیا معقول اور صحت مند غذاؤں کا استعمال کیا جا رہا ہے ، مکمل نیند لیتا ہے ، اور کس شعبے سے تعلق رکھتا ہے ۔ دنیا میں پچھلی پیدائیں قدیم ہونے کے ساتھ آج کل سائنس کی طرح ترقی بھی کر رہی ہیں سائنس اور ماہرین جتنا ان بیماریوں کی تہہ یا جڑوں میں جا کر ان کا مطالعہ اور مقابلہ کرتے ہوئے علاج کے طریقے دریافت کر رہے ہیں اتنی ہی تیزی سے کئی پیدائیں انسانوں کی اپنی غیر ذمہ داری اور لاپرواہی سے جنم لے رہی ہیں اور روز بروز کئی نئی بیماریوں کا شکار ہو کر انسان موت کے منہ میں جا رہے ہیں ، کسی نے زیادہ کھا لیا تو بیمار ہو گیا کم کھایا تو بیمار زیادہ خواب و خرگوش کے مزے لیتا رہا تو بیمار نیند پوری نہیں ہوئی تو بیمار یہ کہنا مناسب ہو گا کہ انسان کچھ کرے یا نہ کرے بیمار ہو ہی جاتا ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ البرٹ آئن سٹائن معمولی لیکن خطرناک حد تک پیپٹ کی موٹی رگ کے پھیل اور سوچ جانے سے موت کا شکار ہوا تھا۔ کئی بیماریوں کی اردو میں ٹرانسلیشن کرنا ناممکن ہونے کے ساتھ اردو میں لکھنا نہایت دشوار ہوتا ہے اور اگر حرف بہ حرف درست طریقے سے لیتی بچھ کر کے نہ لکھا جائے تو مطالعہ کرنے میں دقت پیش آتی ہے تاہم ہمیشہ سے میری کوشش رہی ہے کہ انگریزی کے حروف کی درست اور صحیح الفاظ میں ہامعنی لکھنے کے ساتھ ساتھ مختصر تشریح بھی کروں اور کسی حد تک کامیاب بھی رہا ہوں اس کالم میں بھی کچھ ایسے پیچیدہ طبی الفاظ شامل ہیں جنہیں اردو رسم الخط میں تحریر کرنے میں کافی محنت کی ہے تاکہ دوران مطالعہ آسانی رہے۔ حالیہ طبی رپورٹ کے مطابق پیپٹ کے اندر چلنے والی قدیم بیماری کا واضح طور سے مطالعہ کیا گیا جس کے نتائج منفی ظاہر ہوئے ہیں ، جرمن ماہرین کا کہنا ہے صرف جرمنی میں جیشہ برس سے زائد کے افراد جن کی تعداد پانچ لاکھ ہے اس بیماری میں مبتلا ہیں ، پیپٹ کی اس بیماری کو کسی بھی زبان میں ادا کرنا نہایت مشکل ہے جبکہ مکمل جانکاری حاصل کرنا اور زیادہ مشکل۔ ایڈو میٹل اینیو رسم جسے آؤر تک اینیو رسم بھی کہا جاتا ہے ایک مہلک اور جان لیوا بیماری ہے۔ زیادہ تر افراد اسکی علامات اور اثرات سے واقف نہیں کیونکہ یہ خاموشی سے جسم اور خاص طور پر پیپٹ میں نہایت خاموشی سے پروان چڑھتی ہے اور اسی لئے اسے خاموش قاتل یعنی سائنٹس کلر کہا جاتا ہے۔



جرمن ماہر ڈاکٹر لوڈل کا کہنا ہے جرمنی میں پانچ لاکھ افراد اس بیماری کے ابتدائی علاج کے دور سے گزر رہے ہیں جبکہ ایک لاکھ مبتلا ہونے کے بعد زیر علاج ہیں نتائج آنے میں وقت درکار ہوگا۔ طبی رپورٹ کے مطابق ان افراد کے پیپٹ کی خاص رگ پانچ سینٹی میٹر تک پھولی ہوئی اور سوجن ہے جس کے سبب وہ کسی بھی وقت پھٹ سکتی ہے اور ایسے مریضوں کا فوری آپریشن لازمی قرار دیا ہے تاہم کچھ مریضوں کا علاج تفتیش کے بعد شروع کیا جائے گا، لٹرا سائنڈ سکین سے ڈاکٹروں نے اس بیماری کا پتہ لگایا ہے لیکن جرمنی میں صحت سے متعلق ہمارے سرچینگ کرنے کی ڈاکٹروں کو ادائیگی نہیں کرتے اسلئے کئی مریضوں کو خود ادائیگی کرنا ہوتی ہے جو ایک مہلک علاج ہوتا ہے تاہم روٹین چیکنگ کے دوران اتفاق سے بذریعہ لٹرا سائنڈ اگر معلوم ہو جائے کہ مریض اس بیماری میں مبتلا ہے تو اسکی ادائیگی صحت کا ادارہ کرتا ہے روٹین چیکنگ میں پیپٹ کا لٹرا سائنڈ یا گردے کی تکلیف سے مراد ہے۔ فیملی ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ جیشہ برس سے زائد افراد کو باقاعدگی سے لٹرا سائنڈ کرانا چاہئے اور خاص طور سے ان افراد کیلئے زیادہ اہم ہے جو مونپے میں مبتلا ہیں یا ڈیابیطس ہونے اور کثرت تمباکو نوشی کرتے ہیں یا کمر کے درد کی شکایت کرتے ہیں۔ پیپٹ کے اندرونی نظام میں اکثر معمولی انفیکشن سے بھی اس بیماری میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے کیونکہ انفیکشن کی صورت میں رگیں اکثر زیادہ پھول جاتی ہیں یا اتنی کمزور اور ہادیک ہو جاتی ہیں کہ پھٹ سکتی ہیں اور خون جاری ہونے کی صورت میں فوری موت بھی واقع ہو سکتی ہے ، زیادہ تر مرد اس بیماری میں مبتلا ہیں کیونکہ مردوں کی روزمرہ زندگی گزارنے کا طریقہ خواتین سے مختلف ہوتا ہے مثلاً حفظان صحت پر زیادہ توجہ نہ دینا وغیرہ۔ لٹرا سائنڈ سے فوٹوز حاصل کرنے کے بعد دوسرا قدم کمپیوٹر ٹومو گرافی سے مطلوبہ رگ کا پتہ لگانے کے بعد آپریشن لازمی ہوتا ہے ، پیپٹ چاک کرنے کے بعد زخمی رگ کے ساتھ مصنوعی عضو کلمپس لگا دی جاتی ہے جس سے خون کی سرکولیشن جاری رہتی ہے اور پوزیشن تبدیل کر دی جاتی ہے ، سینٹ گرافٹ کا استعمال کرتے ہوئے اینڈو ویس کیو لری کو بمبی ٹینشن سے رگوں کو مضبوط کیا جاتا ہے اور مریض تین سے سات دنوں میں فٹ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر لوڈل کے مطالعے اور دستاویزی مواد کے پیش نظر ایک سو چوالیس افراد کے سینٹ گرافٹ آپریشن ہوئے اور دو ہزار پندرہ میں اطالوی میگزین دی اٹالین جرنل آف ویسکولر اینڈوویس کیولر سرجری کے عنوان سے شائع ہوئے جس میں تصدیق کی گئی کہ یہ ہی سائنٹس کلر کا کامیاب علاج ہے ۔

§§§

ماحولیاتی آلودگی کا شکار بچے

مصنف: یوسف



عالمی ادارہ صحت کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق اس وقت دنیا بھر میں بچوں کا مستقبل ان کی صحت کے حوالے سے انتہائی خطرے سے دو چار ہے، اس کی وجہ ماحولیاتی آلودگی بتائی گئی ہے۔ اس آلودگی کی وجہ سے ایک اعشاریہ سات ملین بچے ہر سال دنیا بھر میں موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ بچوں کی ہر چار اموات میں سے ایک یا اس سے زیادہ غیر صحتمند ماحول کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ہر سال ماحولیاتی خطرات جن کا تعلق اندرون یا بیرون سے ہوتا ہے جن میں فضائی آلودگی، دھوئیں کی وجہ سے آلودگی، مسر صحت پانی، غیر مناسب سیوریج کا نظام یا سیوریج کے نظام کی عدم دستیابی اور حفظان صحت کے نظام کی خرابی کی وجہ ہر سال سے ایک اعشاریہ سات ملین بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہے لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔

عالمی ادارہ صحت کی دو مزید نئی رپورٹیں بھی منظر عام پہ آئیں جن میں ایک رپورٹ: Inheriting a Sustainable World: کے مطابق ایک ماہ سے پانچ سال کے بچوں کی موت کی وجہ ہیضہ، تلیہ یا اور نمونہ ہیں، جن کا تدارک ماحولیاتی خطرات کو کم کر کے کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ صاف پانی کا حصول، پکانے کے لئے صاف ایندھن کی دستیابی، عالمی ادارہ صحت کی ڈائریکٹر جنرل Dr Margaret Chan, کا کہنا ہے، ”آلودہ ماحول خاص طور پہ بچوں کے لئے مہلک ثابت ہوتا ہے۔ ان کے بڑھتے ہوئے اعضاء، کمزور مدافعتی نظام اور ان کی چھوٹے جسم اور ہوا کے راستے انہیں گندے پانی آلودہ ہوا سے غیر محفوظ بناتے ہیں، ان خطرات کا آغاز ماں کے پیٹ سے شروع ہوتا ہے اور قبل از وقت پیدائش کے خطرات کو بڑھاتا ہے۔ مزید یہ کہ جب اندرون خانہ یا بیرون جب شیر خوار اور سکول جانے سے پہلے کی عمر کے بچے ہوائی آلودگی اور سگریٹ کے دھوئیں سے متاثر ہوتے ہیں تو ان میں نمونہ کے خطرات بڑھ جاتے ہیں اور سانس کی متعدی بیماری جیسا کہ دمہ وغیرہ کا شکار ہونے کے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہوائی آلودگی میں رہنے کی وجہ سے دل کی بیماریوں، کینسر کا بھی خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پانچ بڑی وجوہات جن کا تعلق بچوں کی اموات سے ہے ان کا تعلق ماحولیات سے ہے۔

ایک اور رپورٹ: A companion report, Don't pollute my future! The: impact of the environment on children's health جس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

۵۷۰۰۰۰ پانچ لاکھ ستر ہزار بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہیں ہر سال سانس کی بیماریوں کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے ہیں جو کہ فضائی آلودگی اور سگریٹ کے دھوئیں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

۳۶۱۰۰۰ تین لاکھ اسی ہزار بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہیں صاف پانی تک عدم رسائی، سینیٹیشن کے نظام کی خرابی اور حفظان صحت کے اصولوں پہ عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہیضہ کا شکار ہوتے ہیں جس کی وجہ ہو کر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔

۲۷۰۰۰ دو لاکھ ستر ہزار وہ بچے ہیں جو اپنی عمر کے ابتدائی مہینے میں حفظان صحت کے فقدان، گندے پانی اور فضائی آلودگی کی بدولت اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

۳۰۰۰۰۰ دو لاکھ بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہے تلیہ یا کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں ان کی زندگی کو بچایا جاسکتا ہے اگر ماحول کی صفائی کی جائے اور مچھروں کا تدارک کیا جائے۔

۲۰۰۰۰۰ دو لاکھ بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہیں وہ انجانے میں زخمی ہوتے ہیں مثلاً زہر خورانی، گرنا اور پانی میں ڈوبنا وغیرہ۔

اوپر دیئے گئے اعداد و شمار اگرچہ کہ پوری دنیا سے لئے گئے لیکن اس تناظر میں آج ہم اپنے حالات کا جائزہ لے سکتے ہیں، کہ ہم ماحولیاتی آلودگی کے حوالے سے کس قدر احتیاط برت رہے ہیں، فضائی آلودگی کے حوالے سے عالمی رپورٹیں ہمارے ملک کے بڑے شہروں کے بارے جاری ہوتی رہتی ہیں کہ کس قدر آلودگی بڑھ رہی ہے، ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق کراچی کی فضا میں آلودگی کی تہہ کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے، اس کے علاوہ کراچی ہی کی میڈیا رپورٹس موجود ہیں کہ اکثریتی آبپاشی آلودہ پانی پینے پہ مجبور ہے۔ یہ صورتحال پاکستان کے تمام بڑے اور چھوٹے شہروں کی ہے، بڑی بڑی آبپاشی گٹر وں سے آلودہ پانی پیتی ہیں، فضائی آلودگی کا حال یہ ہے کہ نہ ٹریفک کا نظام فعال ہے جو کہ دھواں چھوڑنے والی گاڑیوں کا تدارک کرے اور نہ ہی فیکٹریوں اور لوگوں کے دھوئیں اور دیگر ویسٹ کو مناسب طریقے سے ٹھکانے لگانے کا کوئی عملی اور فعال نظام موجود ہے، اور مزید یہ کہ سب سے بری حالت سالہ ویسٹ کے نظام کی ہے یا یہ کہنا ہے جانہ ہو گا کہ ملک کے کسی بھی حصے میں قابل سائنس سالہ ویسٹ سسٹم موجود نہیں ہے اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ ہسپتال سانس، معدے، کینسر، گردے، دل کی بیماریوں کے مریضوں سے اُسے پڑے ہیں۔ اور خاص طور پہ بچوں کی اموات ہو رہی ہیں۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ حکومتی سطح پہ ہنگامی بنیادوں پہ کام ہونا چاہئے، خاص طور پہ بلدیاتی نظام کو فعال اور منظم کرنے کی ضرورت ہے اور اس نظام سے کھیٹ اور کالی سمیڑوں کو ٹکائے کی ضرورت ہے تاکہ بہتر لوگ آگے آئیں اور ایک منظم سینیٹیشن پینے کے صاف پانی، سالہ ویسٹ سمیٹھ، ناٹون پلاننگ کے ذریعے ماحولیاتی آلودگی سے ملک کو پاک کرنے میں کردار ادا کریں اور اس کے علاوہ ہر فرد معاشرہ پہ انفراسٹرکچر سطح پہ بھی یہ اولین ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بھی ماحول کو صاف کرنے میں اپنا کردار ادا کرے مثلاً سگریٹ نوشی، سے اجتناب رکھنے میں کھلی جگہوں کو کڑا کرکٹ پھینکے کی عادت کو ختم کرنا، اپنے گلی اور گھر کی سیوریج کے نظام کو بہتر بنانا، کھلی نالیوں کو بند کرنا اور حفظان صحت کے اصولوں پہ نہ صرف خود عمل کرنا بلکہ خاص طور پہ بچوں کی تربیت کرنا۔ اس حوالے سے خاص طور سکولوں اور کالجوں کی سطح پہ تربیت کا نصاب ترتیب دینا نیز پبلک کی آگاہی کے لئے مہمات اور اس سلسلے میں حکومتی اداروں کے شانہ بشان اپنا حصہ ڈالیں۔ مہینہ بچائی کوششوں سے ہی اپنے بچوں کے مستقبل کو محفوظ بنایا جاسکتا ہے۔

نئی زندگی

مصنف: یوسف

۲۰ جنوری کو گیارہ بجے کلاس سے فارغ ہو کر گھر میں بات چیت ہو رہی تھی کہ بیٹ درد ہلکی ہلکی شروع ہو گئی، مقامی ڈاکٹر سے دوائی لی مگر آرام نہ آیا شام ۷ بجے اپنے فیملی ڈاکٹر کے پاس گیا تو انہوں نے میو ہسپتال بھیج دیا کہ منسلکین ہے ساتھ اپنے لیٹر پیڈ پر ہسپتال کے ڈاکٹر کو کچھ ٹیٹ کرنے کا بھی کہا۔ ٹیٹ کئے تو جگر کا منسلک سانسے آیا کچھ آرام آنے کے بعد ہسپتال والوں نے گھر بھیج دیا اگلے دن طبیعت مزید خراب ہو گئی شام فیملی ڈاکٹر کے پاس گیا تو انہوں نے پھر میو ہسپتال میں اپنے میگزین کے ساتھی علی رضا کے ساتھ ہسپتال چلا گیا انہوں نے عارضی علاج کر کے آج پھر مجھے گھر بھیج دیا۔ اتوار کو طبیعت کچھ ٹھیک رہی پیر کو شام کو طبیعت سخت خراب ہو گئی فیملی ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو انہوں نے سب مریضوں کو چھوڑ کر مجھے چیک کیا تو انہوں نے کہا کہ ہسپتال والے آپ کو داخل کیوں نہیں کرتے؟ آپ کی طبیعت سخت خراب ہے۔ آپ کو کوئی سنگین منسلک درپیش ہے۔ آپ فوری ہسپتال جائیں پھر انہوں نے اپنے لیٹر پیڈ پر سرکاری مہر کے ساتھ ہسپتال کے ڈاکٹر کو کچھ ہدایت یا آراء لکھ کر مجھے دیں۔ ہم ہسپتال پہنچ گئے ساتھ ہی ماموں ملک محمود الحسن، سرفراز، حق نواز، ملک قدیر بھی ہسپتال آگئے۔ ہسپتال امیر جنسی میں میڈیکل اور سرجری شعبہ جات کے ڈاکٹر اس بحث میں الجھ گئے کہ یہ ہمارا مریض نہیں ہے۔ مجھے ساتھی میڈیکل والوں کے پاس لے کر جاتے تو وہ کہتے کہ سرجری والوں کے پاس جاؤ سرجری والوں کے پاس جاتے تو وہ کہتے کہ میڈیکل والوں کے پاس جاؤ۔ صورت حال کو دیکھتے ہوئے ملک محمود الحسن ان لیگ لاہور کے جوائنٹ سیکرٹری نے بالال یا سین ایم این اسے کو فون کیا کہ ہمارے مریض کو امیر جنسی میں علاج کی سہولت میسر نہیں بالال یا سین نے ہسپتال فون کیا تو علاج شروع ہو گیا مجھے ۱۰۳ بخار تھا اپنی حالت سے بھی لا علم تھا ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ زندگی کے آخری سانس چل رہے ہیں زبان پر کلمہ طیبہ جاری ہو گیا۔ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اپنے خالق حقیقی کو کچھ دیر بعد ملے والا ہوں۔۔۔ رات کافی بیت چکی تھی وقت دیکھنا یا پوچھنا ممکن نہیں تھا کیونکہ اپنے آپ کا علم بھی نہ تھا اور یہ بھی علم نہ تھا کہ کہاں ہوں؟ ایک وقت ایسا آیا کہ حق نواز بھائی کو دیکھا جو پاس کھڑا انتہائی پریشان تھا مگر شدید بیماری کے باعث اس سے بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔

علاج کرتے کرتے دن کی روشنی نمودار ہو گئی مگر مجھے اس کا علم نہ ہو سکا۔ مجھے بیڈ سے اٹھا کر کہیں لیجانے کیلئے سڑ پھر پر ڈالا گیا

لفٹ کے ذریعے بالائی منزل سے نیچے لایا گیا جب امیر جنسی سے باہر لایا گیا تو پھر سے پر ہارش کے کچھ قطرات پڑے تو احساس ہوا کہ مجھے کہیں اور لیٹایا جا رہا ہے ایوب لینس میں رکھا گیا تو سمجھا شلد کسی اور ہسپتال میں شفٹ کیا جا رہا ہے میرا علاج کرنا میو ہسپتال والوں کے بس میں نہیں ہے۔ ایوب لینس نے پانچ منٹ کے بعد کہیں اتارا وہاں سے مجھے کہیں میں منتقل کیا گیا۔ اس وقت تو علم نہ ہو سکا کہ میں کہاں آیا ہوں البتہ چار پانچ گھنٹوں کے بعد جب کچھ حالت سنبھلی تو پیٹ چلا کہ میو ہسپتال کی گوجرانوالہ وارڈ (ایسٹ سرجیکل وارڈ) میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ یہ ۲۴ جنوری ۲۰۱۷ء منگل کا دن تھا۔ ہر روز ڈاکٹر صبح کو راولپنڈ کرتے چیک کر کے چلے جاتے، ٹیمٹوں کو روزانہ کی بنیاد پر کیا جانے لگا ایک دن وارڈ کے ہیڈ ڈاکٹر امیر افضل راولپنڈ کرتے ہوئے میرے پاس آئے تو انہوں نے کہا کہ اس حالت میں بغیر تشخیص کے جو بھی آپ کا علاج کرے گا وہ خود بھی پریشان ہوگا اور تمہیں بھی پریشان کرے گا۔ میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ تشخیص کیلئے بتائیں کہ ہم کیا کریں انہوں نے کہا کہ آپ M.R.C.P اور P.E.R.C.P کروائیں پھر ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں گے، میں نے استفسار کیا کہ میو ہسپتال سے یہ ٹیٹ ہو جائیں گے تو ڈاکٹر امیر افضل نے بتایا کہ میو ہسپتال سے یہ ٹیٹ نہیں ہو سکتے کیونکہ یہاں پر ان کی سہولت میسر نہیں ہے یہ سن کر میں حیران رہ گیا کہ اشیاء کے سب سے بڑے ہسپتال میں ان ٹیمٹوں کی سہولت موجود نہیں یہ ٹیٹ تو انتہائی اہم ہیں ان کی سہولت تو ہر سرکاری ہسپتال میں ہونی چاہیے یہ سہولت نہ ہونے کے باعث مریض تو بہت ذلیل و رسوا ہوتے ہوں گے حکومت کو چاہیے کہ ان ٹیمٹوں کی سہولتوں ملک بھر کے تمام سرکاری ہسپتالوں میں فراہم کرے۔

M.R.C.P تو سہنگ رام ہسپتال سے جلد ہی ہو گئی مگر E.R.C.P کروانا ہمارے لئے مشکل ترین کام ہو گیا کیونکہ اس ٹیٹ کیلئے جس سرکاری ہسپتال سے رابطہ کرتے تین ماہ دو ماہ، پندرہ کا نام ملتا۔ اتنی دیر انتظار کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ ۱۰۳ بخار دن میں دو سے تین بار ضرور ہوتا تھا جس سے حالت انتہائی خراب حد تک پہنچ چکی تھی۔ حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے مخلص ساتھیوں ڈاکٹر نجم الدین اور بریگیڈیئر (ر) محمد حنیف صاحب نے سی ایم ایچ سے ای۔آر۔سی۔پی کروانے کا فیصلہ کر لیا دو دن میں ہی یہ ٹیٹ اللہ کی توفیق اور مدد سے ہو گیا۔ سی ایم ایچ کے ڈاکٹر نے چھوٹی پتھریاں نکال دیں ایک بڑی پتھری رہ گئی جو آپریشن سے ہی نکل سکتی تھی۔

دونوں ٹیمٹوں سے جو تشخیص ہوئی وہ یہ تھی کہ جگر کے باہر ایک جھیلی بن گئی ہے اور سی۔پی۔ڈی میں پتھری ہے اور آنتوں میں ہوا بھری ہوئی ہے۔ ۱۶ جنوری کو آپریشن کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا حسب معمول ای دن آپریشن ہو گیا یہ آپریشن ڈاکٹر امیر افضل صاحب نے پوری محنت و توجہ اور پیشہ وارانہ

تجربے سے کیا۔ حالت نازک ہونے کے باعث آئی سی یو میں شفٹ کیا گیا جہاں چھ دن تک زیر علاج رہا۔ پھر باہر شفٹ کر دیا گیا آپریشن کے بعد ڈاکٹر وزیر حسن جیسا نرم دل، صحتی معالج ملا جنھوں نے شب دروز ایک کردینے پھر پور توجہ دی ڈاکٹر ذیشان سرور، ڈاکٹر کاشف، ڈاکٹر حنیف کے اخلاق سے بے حد متاثر ہوا نرسنگ سٹاف میں سے کلینک بھائی اور دیگر نرسز کی شبانہ روز محنت نے علاج میں اہم کرلور ادا کیا۔ چاروں وارڈ میں رہنے کے بعد ۲۵ جنوری کو ڈسچارج کر دیا گیا مگر ڈرین اور ٹی ٹیوب نہیں نکالی کیوں کہ ڈاکٹر امیر افضل نے ڈاکٹر کو کہا تھا کہ اس مریض کی یہ دونوں نالیاں لگی رہنے دیں جب تک ریڈیالوجی کی رپورٹ نہیں آجائی۔

ریڈیالوجی کی رپورٹ کے بعد آپریشن تھیر میں بلوایا گیا جہاں ڈاکٹر نے رپورٹ کا مطالعہ کیا تو انھوں نے کہا کہ ابھی دو پتھریاں مزید ہیں صبح وارڈ میں آئیں اگلے دن وارڈ میں گیا تو ڈاکٹر امیر افضل نے رپورٹ دیکھی تو کہا کہ یہ رپورٹ بتا رہی ہے کہ پتھریاں نہیں ہیں جن کو پتھریاں کہا جا رہا ہے وہ درحقیقت پتھریاں نہیں ہیں۔ باقی نالیاں بھی نکال دی گئیں چوبیس گھنٹے وارڈ میں ٹھہرنے کا کہا اگلی صبح راولپنڈ کے دوران مختصر ملاقات کے بعد گھر بھیج دیا گیا۔ چند دن کے بعد فیملی ڈاکٹر، ڈاکٹر عدنان سرور سے ملاقات کی تو انھوں نے ایک تجربہ کار ڈاکٹر کے پاس الٹراساؤنڈ کیلئے ریفر کیا۔ الٹراساؤنڈ کیا گیا تو رپورٹ وہی تھی جو ڈاکٹر امیر افضل نے کہا تھا۔ علاج کے دوران یہ بات خاص طور پر نوٹ کی گئی کہ چھوٹے درجے کے عمل کی تربیت کا شدید فقدان ہے۔ وارڈز میں لواحقین کے خشنے کیلئے ڈیسک، پرانے خستہ حال بیڈز اور گدے عوامی خدمت کی دعوے دار حکومت کو منہ چڑھا رہے تھے۔ علاج کے دوران اسلامی اخوت و موانعات کا عظیم مظہر دیکھنے کو ملا۔ اللہ تعالیٰ ان تمام احباب کی حفاظت فرمائے جنھوں نے بیماری کے دوران راقم کے ساتھ کسی قسم کا بھی تعاون کیا۔

حکیم صاحب

مصنف: یوسف

پنجاب کے شہر گجراتولا میں ایک حکیم صاحب ہوا کرتے تھے، جن کا مطب ایک پرانی سی عمارت میں ہوتا تھا۔ حکیم صاحب روزانہ صبح مطب جانے سے قبل بیوی کو کہتے کہ جو کچھ آج کے دن کے لیے تم کو درکار ہے ایک چنٹ پر لکھ کر دے دو۔ بیوی لکھ کر دے دیتے۔ آپ دکان پر آ کر سب سے پہلے وہ چنٹ کھولتے۔ بیوی نے جو چیزیں لکھی ہوتیں۔ ان کے سامنے ان چیزوں کی قیمت درج کرتے، پھر ان کا ٹوٹل کرتے۔ پھر اللہ سے دعا کرتے کہ یا اللہ! میں صرف تیرے ہی حکم کی تعمیل میں تیری عبادت چھوڑ کر یہاں دنیا داری کے پکڑوں میں آ بیٹھا ہوں۔ جو ہی تو میری آج کی مطلوبہ رقم کا بندوبست کر دے گا۔ میں اسی وقت یہاں سے اٹھ جاؤں گا اور پھر سببی ہوتا۔ کبھی صبح کے ساڑھے نو، کبھی دس بجے حکیم صاحب مریضوں سے فارغ ہو کر واپس اپنے گاؤں چلے جاتے۔

ایک دن حکیم صاحب نے دکان کھولی۔ رقم کا حساب لگانے کے لیے چنٹ کھولی تو وہ چنٹ کو دیکھتے دیکھتے ہی رہ گئے۔ ایک مرتبہ تو ان کا دماغ گھوم گیا۔ ان کو اپنی آنکھوں کے سامنے تارے چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے لیکن جلد ہی انھوں نے اپنے اعصاب پر قابو پا لیا۔ آٹے والے وغیرہ کے بعد بیگم نے کھانا کھا، بیٹی کے جینز کا سامان۔ کچھ دیر سوچتے رہے پھر۔۔۔ چیزوں کی قیمت لکھنے کے بعد جینز کے سامنے لکھا ”یہ اللہ کا کام ہے اللہ جانے۔“

ایک دو مریض آئے ہوئے تھے۔ ان کو حکیم صاحب دوائی دے رہے تھے۔ اسی دوران ایک بڑی سی کار ان کے مطب کے سامنے آ کر رکی۔ حکیم صاحب نے کار یا صاحب کار کو کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ کئی کاروں والے ان کے پاس آتے رہتے تھے۔

دونوں مریض دوائی لے کر چلے گئے۔ وہ سوئڈہونڈ صاحب کار سے باہر نکلے اور سلام کر کے بیچ پر بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ اگر آپ نے اپنے لیے دوائی لینی ہے تو اوپر سٹول پر آجائیں تاکہ میں آپ کی نبض دیکھ لوں اور اگر کسی مریض کی دوائی لے کر جانی ہے تو بیماری کی کیفیت بیان کریں۔

وہ صاحب کہنے لگے حکیم صاحب میرا خیال ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ لیکن آپ مجھے پہچان بھی کیسے سکتے ہیں؟ کیونکہ میں ۱۵، ۱۶ سال بعد آپ کے مطب میں داخل ہوا ہوں۔ آپ کو گزشتہ ملاقات کا احوال سناتا ہوں پھر آپ کو ساری بات یاد آجائے گی۔ جب میں پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا تو وہ میں خود نہیں آیا تھا۔ مجھے خدا نے آپ کے پاس لے آیا تھا کیونکہ خدا کو مجھ

پر رحم آگیا تھا اور وہ میرا گھر آلا کرنا چاہتا تھا۔ ہوا اس طرح تھا کہ میں لاہور سے میرپور اپنی کار میں اپنے آہائی گھر جا رہا تھا۔ عین آپ کی دکان کے سامنے ہماری کار پکچر ہو گئی۔ ڈرائیور کار کا پیپر تار کر پکچر لگوانے چلا گیا۔ آپ نے دیکھا کہ میں گرمی میں کار کے پاس کھڑا ہوں۔ آپ میرے پاس آئے اور آپ نے مطب کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ لاہر آ کر کرسی پر بیٹھ جائیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے آپ کا شکریہ ادا کیا اور کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے کچھ زیادہ ہی دیر لگا دی تھی۔ ایک چھوٹی سی بچی بھی یہاں آپ کی میز کے پاس کھڑی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی ”چلیں ناں، مجھے بھوک لگی ہے۔ آپ اسے کہہ رہے تھے بیٹی تھوڑا صبر کرو ابھی چلتے ہیں۔

میں نے یہ سوچ کر کہ اتنی دیر سے آپ کے پاس بیٹھا ہوں۔ مجھے کوئی دوائی آپ سے خریدنی چاہیے تاکہ آپ میرے ٹھنڈے کو زیادہ محسوس نہ کریں۔ میں نے کہا حکیم صاحب میں ۵، ۶ سال سے انگلیٹھ میں ہوتا ہوں۔ انگلیٹھ جانے سے قبل میری شادی ہو گئی تھی لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ یہاں بھی بہت علاج کیا اور وہاں انگلیٹھ میں بھی لیکن ابھی قسمت میں

ماریسی کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا۔

آپ نے کہا میرے بھائی! توبہ استغفار پڑھو۔ خدا را اپنے خدا سے مایوس نہ ہو۔ یاد رکھو! اس کے خزانے میں کسی شے کی کمی نہیں۔ اولاد، مال و اسباب اور غری خوشی، زندگی موت ہر چیز اسی کے ہاتھ میں ہے۔ کسی حکیم یا ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی دوا میں شفا ہوتی ہے۔ شفا اگر ہوتی ہے تو اللہ کے حکم سے ہوتی ہے۔ اولاد دینی ہے تو اسی نے دینی ہے۔

مجھے یاد ہے آپ ہائیں کرتے جا رہے اور ساتھ ساتھ پڑیاں بنا رہے تھے۔ تمام دوائیاں آپ نے ۲ حصوں میں تقسیم کر کے ۲ لفافوں میں ڈالیں۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے بتایا کہ میرا نام محمد علی ہے۔ آپ نے ایک لفافہ پر محمد علی اور دوسرے پر بیگم محمد علی لکھا۔ پھر دونوں لفافے ایک بڑے لفافہ میں ڈال کر دوائی استعمال کرنے کا طریقہ بتایا۔ میں نے بے دلی سے دوائی لے لی کیونکہ میں تو صرف کچھ رقم آپ کو دینا چاہتا تھا۔ لیکن جب دوائی لینے کے بعد میں نے پوچھا کتنے پیسے؟ آپ نے کہا بس ٹھیک ہے۔ میں نے زیادہ زور ڈالا، تو آپ نے کہا کہ آج کا کھانا بند ہو گیا ہے۔

میں نے کہا مجھے آپ کی بات سمجھ نہیں آئی۔ اسی دوران وہاں ایک اور آدمی آچکا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کھانا بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آج کے گھر یلو اخراجات کے لیے جتنی رقم حکیم صاحب نے اللہ سے مانگی تھی وہ اللہ نے دے دی ہے۔ مزید رقم وہ نہیں لے سکتے۔ میں کچھ حیران ہوا اور کچھ دل میں شرمندہ ہوا کہ میرے کتنے گھٹیا خیالات تھے اور یہ سادہ سا حکیم کتنا عظیم انسان ہے۔ میں نے جب گھر جا کر بیوی کو

دوائیاں دکھائیں اور ساری بات بتائی تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا وہ انسان نہیں کوئی فرشتہ ہے اور اس کی دی ہوئی ادویات ہمارے من کی مراد پوری کرنے کا باعث بنیں گی۔ حکیم صاحب آج میرے گھر میں تین پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔

ہم میاں بیوی ہر وقت آپ کے لیے دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ جب بھی پاکستان چھٹی آئی۔ کار پاور روکی لیکن دکان کو بند چلا۔ میں کل دوپہر بھی آیا تھا۔ آپ کا مطب بند تھا۔ ایک آدمی پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے کہا کہ اگر آپ کو حکیم صاحب سے ملنا ہے تو آپ صبح ۹ بجے لازماً پہنچ جائیں ورنہ ان کے ملنے کی کوئی گارنٹی نہیں۔ اس لیے آج میں سویرے سویرے آپ کے پاس آگیا ہوں۔

محمد علی نے کہا کہ جب ۱۵ سال قبل میں نے یہاں آپ کے مطب میں آپ کی چھوٹی سی بیٹی دیکھی تھی تو میں نے بتایا تھا کہ اس کو دیکھ کر مجھے اپنی بھانجی یاد آ رہی ہے۔

حکیم صاحب ہمارا سارا خاندان انگلیٹھ سیٹل ہو چکا ہے۔ صرف ہماری ایک بیوہ بچہ ہمیں اپنی بیٹی کے ساتھ پاکستان میں رہتی ہے۔ ہماری بھانجی کی شادی اس ماہ کی ۲۱ تاریخ کو ہونا تھی۔ اس بھانجی کی شادی کا سارا خرچ میں نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ ۱۰ دن قبل اسی کار میں اسے میں نے لاہور اپنے رشتہ داروں کے پاس بھیجا کہ شادی کے لیے اپنی مرضی کی جو چیز چاہے خرید لے۔ اسے لاہور جاتے ہی بخار ہو گیا لیکن اس نے کسی کو نہ بتایا۔ بخار کی گولیاں ڈیپہرین وغیرہ کھاتی اور پڑاڑوں میں پھرتی رہی۔ بازار میں پھرتے پھرتے چانک بے ہوش ہو کر گری۔ وہاں سے اسے ہسپتال لے گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اس کو ۱۰۶ ڈگری بخار ہے اور یہ گرون توڑ بخار ہے۔ وہ بے ہوشی کے عالم ہی میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئی۔

اُس کے فوت ہوتے ہی خاندان کیوں مجھے اور میری بیوی کو آپ کی بیٹی کا خیال آیا۔ ہم میاں بیوی نے اور ہماری تمام فیملی نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنی بھانجی کا تمام جینز کا سامان آپ کے ہاں پہنچا دیں گے۔ شادی جلد ہو تو اس کا بندوبست خود کریں گے اور اگر ابھی کچھ دیر ہے تو تمام اخراجات کے لیے رقم آپ کو نقد پہنچا دیں گے۔ آپ نے ناں نہیں کرئی۔ آپ اپنا گھر دکھا دیں تاکہ سلمان کا ٹرک وہاں پہنچایا جاسکے۔

حکیم صاحب حیران و پریشان یوں گویا ہوئے ”محمد علی صاحب آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں مجھے سمجھ نہیں آ رہا، میرا اتنا دماغ نہیں ہے۔ میں نے تو آج صبح جب بیوی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چنٹ یہاں آ کر کھول کر دیکھی تو مریخ مسالہ کے بعد جب میں نے یہ الفاظ پڑھے ”بیٹی کے جینز کا سامان“ تو آپ کو معلوم ہے میں نے کیا لکھا۔ آپ خود یہ چنٹ ذرا دیکھیں۔ محمد علی صاحب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ”بیٹی کے جینز“ کے سامنے کھانا ہوا تھا ”یہ کام اللہ کا ہے، اللہ جانے۔“

محمد علی صاحب یقین کریں، آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ
بہوی نے چٹ پر چیز لکھی ہو اور مولانا نے اُس کا اسی دن
بندوبست نہ کر دیا ہو۔ واہ مولانا واہ۔ تو عظیم ہے تو کریم ہے۔
آپ کی بھانجی کی وفات کا صدمہ ہے لیکن اُس کی قدرت پر
حیران ہوں کہ وہ کس طرح اپنے معجزے دکھاتا ہے۔
حکیم صاحب نے کہا جب سے ہوش سنبھالا ایک ہی سبق پڑھا کہ
”صبح ورد کرنا ہے“ رازق، رازق، تو ہی رازق“ اور شام کو ”شکر،
شکر مولانا تیرا شکر

§§§

نہنی پری

مصنف: یوسف



اور آوازیں کس رہے تھے اب میں نے بغور اس لڑکی کی طرف دیکھا تو سامنے ایک پندرہ سولہ سال کی سول کے بونڈم میں ملبوس کسی چھوٹے شہر کی دھان پان سی سادہ لڑکی نظر آئی جھکے بیٹھی تھی اس کی گود میں اس کا کتا ہوں کا بگ بھی تھا پہلے تو میں پکا مزاق سمجھ کر گزر گیا اب مجھے معاملہ سنجیدہ نظر آنے لگا میں تھوڑی دور جا کر رک گیا اور حالات کا سنجیدگی اور نزاکت کا احساس کر نے لگا۔ میں غور سے دیکھ رہا تھا تین یا چار لڑکے تھے جو ہار ی ہار ی اس کو گنگ کر رہے تھے وہ لڑکی سر جھکائے بیٹھی تھی اس کے پاس اس کی کوئی ساتھی یا بزرگ نہیں تھا میں نے چند منٹوں میں ہی اندازہ لگا لیا کہ یہ اکیلی لڑکی ہے اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں سورج غروب ہونے کو تھا رات کا آچل تیزی سے روشنی کو نگل رہا تھا نیم اندھیرے کی وجہ سے لڑکوں کی بد تمیزی میں اضافہ ہو تا جا رہا تھا بلکہ وہ شاید اندھیرے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ وہ زیادہ بد تمیزی کر سکیں میں سمجھ نہیں سکتا تھا کہ کوئی اس لڑکی کو یہاں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے اور یہ بھاری اس کا یا تو انتظار کر رہی ہے یا پھر اس کو سمجھ نہیں آ رہی کہ اب اس پر دہلی شہر میں وہ کیا کرے وہ مجبوری بے بسی کا بت بنی بیٹھی تھی اب میں جان چکا تھا کہ لڑکی شدید خطرے میں ہے اور کسی خوش فحاک حادثے کا شکار ہو سکتی ہے میں نے فوری طور پر اپنے وقت سیکورٹی گارڈ کو بلا دیا اور اس لڑکی کی طرف بڑھا مجھے اور سیکورٹی گارڈ ڈکو آتے دیکھ کر ادبائش بڑے تیزی سے بھاگ گئے میں آہستہ آہستہ بیٹی کے پاس ہو گیا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر بری طرح ڈر گئی خوف اور پر دہلی کی وجہ سے اس کا جسم لرز رہا تھا اس کے چہرے پر خوف کی زردی پھیلی ہوئی تھی اور آنکھوں میں خوف دہشت و ایرانی اور قبرستان کے سانے کا راج تھا میں شفیق لہجے میں بولا بیٹی مجھ سے ڈرو نہ میں آپ کے باپ جیسا ہوں تم میری بیٹی ہو اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے آپ میری بیٹی ہو اب تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے میرے لہجے کی شفقت اور مٹھاس سے اس کی آنکھوں میں زندگی کی رقع لہرائی اور اس نے میری طرف دیکھا میرے شفقت سے لہریز لہجے سے اس کے اندر جیسے کوئی آنسوؤں کا جھرن پھوٹ پڑا جیسے خود بخود کوئی والو کھل گیا ہو اور پا نی بہنا شروع ہو گیا اس کی معصوم آنکھوں میں عجیب سا سیلاب تھا جو اب بند تو نہ کر بہہ نکلا تھا نہ اس کے چہرے کا زاویہ بدلانہ ہی کوئی آہ بکا نہ سسکی نہ جھن نہ آواز پانی اس کی آنکھوں سے اس کے رخساروں کو مسلسل تر کر نے لگا اس کے اندر کا کرب اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا خوف اور دہشت سے وہ شاید قوت گویائی سے محروم ہو چکی تھی آنسوؤں کی ککڑت نے اس کی قوت گویائی چھین لی تھی یا وہ ککڑت کا شکار ہو چکی تھی مجھے اس پر بہت پیا آ رہا تھا میں اس کی بے بسی اور آنسوؤں کی برسات سے اندر ہی اندر کٹ رہا تھا وہ تنہی معصوم پری اپنے آنسوؤں سے اپنے اوپر ہو نے والے طلسم کی داستان سنا رہی تھی۔ میرے شفقت بھرے رویے کی وجہ سے اس نے کئی بار بو لنے کی کوشش کی لیکن زبان شاید اس کے اختیار میں نہیں تھی یا خوف نے اس کے جسم و جان کو اس بری طرح جکڑا ہوا تھا کہ الفاظ زبان پر آنے سے پہلے ہی جھٹیل ہو جاتے تھے اس کے اعصاب اور عضلات کسی بہت بڑی منفی کمیائی تبدیلی سے گزر رہے تھے کہ اُن کا اس میں تا ل میل ختم ہو حرکت بیٹھی تھی مجھے لگ رہا تھا وہ شاید نیم فانی کیفیت کا شکار ہو چکی ہی وہ اپنے آپ میں نہیں تھی اس کا جسم اور دماغ کسی شدید حادثے سے گزرنے کے بعد کام کرنا چھوڑ چکے تھے اس کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہ جا رہی تھی میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے سر پر رکھ دیا محفوظ ہو تم بالکل نہ ڈرو وہ خاموش گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی درد دکھ نمی بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا وہ رونے کی کوشش نہیں کر رہی تھی آنسو اس کے ضبط کے سادے بندھن تو نہ کر خو د بخود بے جا رہے تھے اس کے اندر پتہ نہیں کتنے سمنوں کا پانی تھا جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اس کا معصوم نازک چہرہ لگا تا ر آنسوؤں سے جھجک چکا تھا میں چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ بولے الفاظ نکلے وہ مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا گیا اور پھر بلک بلک کر رونے لگی۔

میں حسبِ معمول اپنے گھر کے قریب وسیع و عربیہ پارک میں شام سے پہلے واک کرنے آیا ہوا تھا سردیوں کا آغاز ہو چکا تھا گرمیاں رخصت ہو رہی تھیں ٹھنڈی ہواؤں میں خشکی کا احساس بڑھ رہا تھا موسم کی خوشگواریت کی وجہ سے بہت سارے لوگ پارک میں آئے ہوئے تھے بچے، نوجوان، بڑے اور بوڑھے ہر ہر عمر کے لوگ سبز پھول درخت جھیل ہر طرف خدا کی قدرت اپنی رعنائی کا اور دلکشی کا مسحور کن احساس دلا رہی تھی کیونکہ گرمی کے بعد اب ٹھنڈ شروع ہو چکی تھی اس لیے واک کرنے والے اور پارک کی سیر کرنے والوں کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی میں جو بچپن سے سبزے ہریالی درخت پھول جھیل فطرت کا شوقین ہوں سب کچھ انجائے کرتا ہوا تیزی سے مٹی کے وانگ ٹریک پر اوپر اوپر دیکھتا بڑے بڑے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا حسبِ معمول میرے ہونٹوں پر اہمہ الحسنی کا ورد جاری تھا پارک سبز فطرت کے خوبصورت مناظر اور اللہ کا ذکر سبحان اللہ میرا جسم اور روح کیف انگیز کیفیت کو انجائے کر رہے تھے خوشگوار موسم کے اثرات سے میرا جسم روح سرشاری کی حالت میں تھے دوران واک چند ایسے دوستوں کا سامنا بھی ہوا جو اکثر یہاں واک کرتے ہیں ان سے مسکراہٹ کا تبادلہ کر کے میں آگے بڑھتا جا رہا تھا کیونکہ پارک میں لاہو ر کے لوگوں کے علاوہ بہت بڑی تعداد مسافروں یا باہر سے آنے والے لوگوں کی ہوتی ہے مختلف علاقوں سے آنے والے لوگوں کا اپنا اپنا کچھ زبانیں رنگ و جسامت یہ سب مل کر ایک مخلوط کچھ سا بنادیتے ہیں میں اُن کو بغور دیکھتا جا رہا تھا اکا دکا نئے شادی شدہ جوڑے بھی نظر آ رہے تھے جو دنیا مافیہا سے بے خبر اپنی ہی دھن میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بیٹھے یا چلتے نظر آ رہے تھے یہ نئے شادی شدہ جوڑے اپنی ہی دھن میں شادی کے خمار میں مست چہروں پر رنگوں کی قوسِ قزح نکھیرے نظر آ رہے تھے میں چونکہ بچپن سے متجسس مزاج رکھتا ہوں اور اس لیے بغور لوگوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا پارک میں اکثر نوجوانوں کے مختلف ٹولے بھی نظر آتے ہیں جو نوجوان لڑکیوں کو چھپنے یا آوازیں کسنے سے باز نہیں آتے وہ بھی نظر آ رہے تھے ہر شریف انسان کی طرح مجھے بھی ان پر بہت غصہ آتا تھا لیکن ساتھ یہ بھی سوچ کہ یہ عمری ایسی ہے جس میں خوف ہوش کی بجائے صرف جوش اور جوش ہی ہوتا ہے اس لیے ایسے لڑکوں کو نظر انداز کر دیتا میں واک کرتا ہوا پارک کے ایسے حصے میں آگیا جہاں مجھے ایسا ہی ادبائش نوجوانوں کا ٹولا نظر آیا جو شاید کسی لڑکی کو گنگ یا اس پر آوازیں کس رہے تھے میں روزانہ کی طرح نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا لیکن جب واک کرتا ہوا پارک پھر لگا کر دوبارہ اسی جگہ پر آیا تو دیکھا کہ وہ لڑکے اسی طرح ہی لڑکی کو گنگ

ہمارا گھر مندر بن گیا تھا

مصنف: یوسف

ایک مضمون دیکھئے کچھ اس طرح لکھا ہے کہ ’’گھروں سے دریافت ہونے والی عجیب اشیاء کوئی کالا مال تو کوئی خوف سے نڈھال‘‘

اس میں مغربی ممالک میں مختلف گھروں سے پرانے کینوں کی چھوڑی ہوئی اشیاء کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ آسٹریا میں کسی گھر میں کینوں کو ہاتھ روم کی دیوار سے ایک کوریائی میزائل ملا۔ ایک امیر جرمن باشندے کو اپنے گھر کے تہ خانے سے جنگ عظیم کے دور کے ہتھیار ملے جن میں ایک ٹینک اور توپ بھی شامل تھی۔ اسی طرح ایک دوسرے ملک چیک ری پبلک میں گھر کے اندر کسی کام کے سب کھدائی کی گئی تو کسی گرجا گھر کی چار صد سال پرانی گھنٹی ملی۔

لیکن یہ جبرانی کی بات نہیں ہے۔ پاکستان میں بھی ایسی اشیاء نکلتی رہتی ہیں۔

اور ایسی ہی کچھ اشیاء مجھے ہامی کی واپسوں میں لے جا رہی ہیں۔۔۔ نوشہی۔ بلوچستان کا ایک دور افتادہ مقام ہے جو تقریباً ایران جانے والی شاہ راہ پر واقع ہے۔ یہ قصبہ انگریزوں نے نہایت ہی منصوبہ بندی سے بنایا تھا۔ تمام سڑکیں گلیاں کشادہ اور ایک دوسرے سے قائمہ زاویہ بنائی ہوئی ملتی ہیں۔ یہ 1954ء - 55ء کا زمانہ تھا۔ ہم اسی خوبصورت قصبے میں رہتے تھے۔ مکان کا نمبر بھی ابھی تک یاد ہے۔ یہ 102 تھا۔ انگریزوں نے اپنے لئے ایک ٹینس کورٹ بھی بنایا ہوا تھا۔ جس کے فرش پر ہم خانے بنا کر اسٹاپو وغیرہ کھیلا کرتے تھے۔

قیام پاکستان سے قبل یہاں ہندو کافی تعداد میں تھے کیونکہ ارد گرد کے علاقوں کے لئے یہ ایک بہت بڑا تجارتی مرکز تھا اور ہندو اس تجارت کے کرتا دھرتا تھے۔ قیام پاکستان کے بعد کافی تعداد میں ہندو یہاں سے ہجرت کر کے بھارت چلے گئے تھے لیکن پھر بھی ان کی ایک کافی تعداد رہ گئی تھی۔

ایک دن اباجان مرحوم نے گھر کے صحن میں کپاری بنا کر مختلف پھول لگانے کا ارادہ کیا۔ دروازے کے قریب ہی ایک مناسب جگہ دیکھ کر کھدائی کی۔ ہم بچے بھی اباجان کا ساتھ دے رہے تھے اور مٹی اٹھا اٹھا کر قریب ہی ڈھیر کرتے جا رہے تھے۔ اچانک ایک چھوٹا سا پتھر بیچے گرا۔ میں چونک گیا کہ پوری مٹی میں پتھر نہیں تھا یہ کہاں سے نکل آیا۔ اسے اٹھایا اور اسے دیکھنے لگا۔ بھائی جان جو قریب ہی کھڑے تھے انہیں بھی تجسس ہوا اور وہ بھی کام چھوڑ کر میرے قریب آگئے اور اسکی مٹی صاف کرنے لگے۔ اور ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ وہ پتھر نہیں تھا بلکہ ایک گائے کی شکل کا کھلونا تھا۔

میں اس وقت چار پانچ برس کا تھا۔ میں نے تو اسی وقت اس سے کھیلنا شروع کر دیا۔

اباجان مرحوم نے کپاری میں بیج بونے۔ ایک دو بیہریاں بھی اباجان مرحوم نے کہیں سے لا کر لگا دیں۔ ایک دو دن گزر گئے۔ ہم نے گائے کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی۔

نہ جانے ہندوؤں کو کیسے اس کا علم ہو گیا۔

غالباً باقی مرحومہ یا بھائی جان میں سے کسی نے اسکول میں میں تذکرہ کیا تھا اور کسی ہم جماعت کو وہ گائے دکھائی بھی تھی۔ اس کے بعد تو ہندو خواتین کا ہمارے گھر تانتا بندھ گیا۔ وہ نہ جانے کیا کیا چیزیں لے کر آئیں، اور اس مقدس پوتر دھرتی جہاں سے لکڑی کی گائے نکلی تھی کہ پھیرے لگا تیں۔ پھر کسی ناییدہ ہستی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتیں اور سر نہوڑائے بیٹھ جاتیں۔ دھیمی دھیمی آواز میں کوئی اشولک پڑھتیں۔ اس کپاری کی مٹی کو اپنی انگلی سے چھوتیں اور نہ جانے کیا رسومات کرتیں۔ ان کے پاس ایک چھوٹی سی گھنٹی ہوتی تھی اسے ہلکی ہلکی آواز میں بجاتی تھیں۔ ان کی کوشش ہوتی کہ جب والدین نہ ہوں اس وقت آئیں اور اپنی رسومات ادا کریں۔ یہ کیا ہو رہا تھا اس کا تو ہم بچوں کو علم نہیں تھا لیکن ان کے آنے سے ہم خوش بہت ہوتے تھے کیوں کہ وہ طرح طرح کی مٹھائیاں ’لڈو وغیرہ‘ پیتل کی تھالیوں میں رکھ کے لائیں اور کپاری کے گرد ان کو لیکر گھومتے اور ہمیں بھی پرشوہے کہہ کر دیتی تھیں۔ ہمارا گھر تو ایک قسم کا مندر بن گیا تھا۔ بعد میں اسی آئیں تو ہمیں بہت غصہ ہوتی تھیں۔ خیر بعد میں اباجان نے وہ گائے وہاں کے ایک معترف ہندو کو دے دی تھی۔ ہندو اس مقام سے بہت سی مٹی بھی کھود کر لے گئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ پوتر مٹی ہے۔ اس کے بدلے میں ہندوؤں نے کہیں اور سے مٹی لا کر ڈال دی تھی۔

اس طرح کا ایک قصہ ابن صفی (مشہور جاسوسی ناول نگار۔ عمران فریدی اور کپٹن حمید کے کرداروں کے خالق) کے فرزند جناب احمد صفی بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ راولپنڈی میں نانا ابو کو جو گھر فوج کی طرف سے الاٹ ہوا وہ اس سے قبل کسی ہندو خاندان کا تھا جو ہجرت کر گیا تھا۔ والدہ مرحومہ نے بتایا کہ ایک کمرے کی دیوار دھری بنی ہوئی تھی اور اس پر ہاتھ مارے تو پیسے برتنوں کے جھجھکنے کی آواز آتی تھی۔۔۔ نانا ابو کے سخت حکم کی وجہ سے کسی نے بھی اس دیوار کو نہ چھیڑا۔ بعد کو جب یہ مکان کسی اور کو بیچا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے اس دیوار کو قودا تو اندر سے گر ہستی کا پورا مسلمان برآمد ہوا۔ شلڈ کسی کے جھیز کے لیے رکھا گیا تھا۔۔۔ اور نہ جانے اس مسلمان کے علاوہ کیا کیا نکلا ہو جس کا پتہ ہی نہ چل سکا۔۔۔ ہجرت کے زمانے میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں۔

اس طرح کا ایک واقعہ جنگ اخبار کے کالم "ناقابل فراموش" میں بھی چھپا تھا۔ ایک مسلمان خاندان

بھارت سے ہجرت کر کے آیا تو اس خاندان کو کراچی میں کوئی فلیٹ الاٹ ہوا۔ وہ اس میں رہنے لگے۔ ایک دن کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو پتہ چلا کہ کوئی اجنبی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ ہندوستان سے آیا ہے اور ہجرت سے پہلے اسی فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ ہندو ہے۔ دو تین دن فلیٹ میں آتا رہا۔ پھر ایک دن اس نے راز دارانہ انداز میں کہا کہ اس کے پاکستان آنے کا ایک مقصد ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مجھے والے اس خاندان کے اخلاق، کردار اور ایمانداری کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ اس ہندو نے کہا کہ یہ سب کچھ معلوم کرنے کے بعد اسے امید واثق ہے کہ مقصد میں کامیابی ہو جائے گی۔ اس تمہید کے بعد اس ہندو نے کہا کہ ہمارے کے وقت جب وہ ہندوستان جا رہا تھا تو اس کے پاس بہت سا سونا تھا لیکن اس وقت کے حالات میں اسے لے جانا بہت دشوار تھا۔ آخر اس ہندو کو ایک ہی حل سمجھ میں آیا کہ سونا اسی فلیٹ میں چھوڑ دیا جائے اور بعد میں حالات صحیح ہو جائیں تو لے جائے۔ اس ہندو نے سونے کو ہارڈک سی تار میں تھپیل کیا اور گھر کی چھت اور دیواروں میں بچھی ہوئی بجلی کی تاروں کے ساتھ ساتھ یہ سونے کی تار بھی بچھادی۔ اس ہندو نے کہا کہ اب اسکی بہن یا بیٹی کی شادی ہے اور وہ اس امید پر پاکستان آیا ہے کہ اسے اپنا سونا مل جائے گا

پاکستانی نے بغیر کسی تردد کے کہا "مجھے تو اس کا علم نہیں لیکن جناب یہ آپ کی لمانت ہے۔ آپ بلا کسی تامل کے اپنی لمانت لے جا سکتے ہیں"

ہندوستان سے آئے ہوئے فرد کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ تو سوچ کر آیا تھا کہ نئے مالک مکان کو اس میں سے نصف حصہ دے دے گا لیکن یہاں تو ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ خیر قصہ مختصر سابق مالک نے پوری رات لگا کر بجلی کی تاروں کے ساتھ لگا ہوا اپنا سونا نکال لیا۔ اس نے نئے مالک مکان کو ایک بار پھر اپنی پیش کش دہرائی لیکن پاکستانی کا کہنا تھا کہ وہ شے جس کا مکان سے کسی طرح کا تعلق ہی نہیں بنا وہ کیسے لے سکتا ہے۔

قصہ مختصر ہندوستانی باشندے نے سونے کی تاریں لیں۔ اس نے جانے کیا انتظام کئے تھے کہ بحیرت اپنے ملک چلا گیا۔ وہاں جا کر بحیرت سے پہنچ جانے کی اطلاع دی۔ دو مہینے بعد اس کی طرف سے شادی کارڈ بھی آیا جس میں اس پورے پاکستانی خاندان کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔

ناقابل فراموش میں شائع شدہ کہانی سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ غالباً 1960 یا 1961ء کا قصہ ہے۔ ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ جب وہ مشرقی پنجاب یا بھارت کے دیگر علاقوں سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور الاٹ شدہ مکان میں داخل ہوئے تو ایسے لگتا تھا کہ اصل کھین کہیں نزدیک ہی گئے ہیں۔ جانے والے ہندوؤں کو کامل یقین تھا کہ واپس اپنے گھروں میں آئیں گے

- قرہ الامین حیدر اپنی کتاب ”روشنی کی رفتار“ صفحہ 116 پر لکھتی ہیں کہ جب اسپین سے مسلمان نکل کر مراکش پہنچ رہے تھے تو وہ اپنے اندلی گھر کی چابیاں مراکش میں دیواروں پر ٹانگ دی تھیں انہیں امید تھی کہ واپسی ہو گی۔

§§§
